دکھاجائے کہ تم حکمانہ اتھارٹی کے ساتھ اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنا چاہتے ہو۔

سلہری صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ نظریات وتصورات کے انتخاب کا حق عوام کو ہونا چاہیئے۔ ضرور ہونا چاہیئے۔ چنانچہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے عوام کے اسی حق کو سامنے رکھ کر اسلامی دستور اور اسلامی نظام کے تصورات ہمیشہ عوام تک پہنچائے ہیں اور جو مطالبہ بھی پیدا ہوا ہے عوام ہی کے اندر سے پیدا ہوا ہے۔ پھر اداریہ میں لکھا گیا ہے کہ پارلیمنٹری ادارات عوام کے اجتماعی تصورِ اسلام کے اظہار کا مناسب ترین ذریعہ ہیں۔ اور اسی ذریعہ سے کسی چیز کو نافذ ہونا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مودودی صاحب یا جماعتِ اسلامی نے کوئی مسلح بغاوت کرا کے یا کسی با اختیار فرد کے سر پر پستول رکھ کر کوئی بات آج تک منوائی ہے اور کبھی پارلیمنٹری راستے سے ہٹ کر اپنے دستوری تصورات کو ملک پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے؟ اب تک اس سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے انھی پارلیمنٹری ادارت کے ذریعے ہوا ہے۔ قراردادِ مقاصد اسی ذریعے سے پاس ہوئی تھی، رہنما اصول اسی طریقے سے طے پائے تھے اور مسودۂ دستور نے ایک خاص شکل اسی طریقے سے اختیار کی تھی۔ لیکن دوسری طرف سے اس دوران میں قدم قدم پر رائے عام کو دبانے اور اس سے انحراف کرنے اور اس کے خلاف سازشیں کرنے کی تدبیریں لڑائی جاتی ہیں۔ آخر میں جب ان تدبیروں کے علی الرغم کسی نہ کسی حد تک اسلامی خطوط پر دستور سازی کا کام تکمیل کو آپہنچا تو سرے سے دستور ہی کا وجود ہی ختم کرنے کی کوشش کر ڈالی گئی۔

ایک ایک حرف جو سلہری صاحب نے لکھا ہے کہ یہ ہونا چاہیے اور یہ نہ ہونا چاہیے، وہ ٹھیک اسی موقف کی تصویر پیش کرتا ہے جسے جماعت اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آسکا کہ پھر اعتراض کس چیز پر ہو رہا ہے اور درسِ عبرت کس معاملے میں دیا جا رہا ہے؟

ہاں! آخر میں یہ بھی پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ جن عوام کو سلہری صاحب بار بار فائنل اتھارٹی اور فیصلہ کن طاقت قرار دے رہے ہیں، ان کی اتھارٹی اور ان کے اختیار کی کیا گت گذشتہ سات برس میں بنتی رہی ہے اور آج کیا بن رہی ہے۔ عوام کو کب کسی نے پوچھا ہے کہ تم کون ہو، کہاں رہتے ہو، کس طرح سوچتے ہو، کیا چاہتے ہو؟ مسلم لیگ کا تعلق پاکستان بنتے ہی عوام سے کٹ چکا حکمران طبقے کا حال یہ ہے کہ وہ پہروں میں چلتا ہے اور ریڈیو پر سے وعظ کہہ دیتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہمارے اکابر کسی مسئلے کو لے کر میدان میں آئیں، لوگوں کی آنکھوں سے آنکھ ملا کر بات کریں، اپنے دلائل دیں اور ان کے دلائل سنیں، معلوم کریں کہ ان کے مسائل اور مطالبات کیا ہیں، وہ کیسا نظام زندگی چاہتے ہیں اور وہ کن تبدیلیوں کے لیے بیچین ہیں؟

اتنا ہی نہیں کہ عوام سے قریب ہو کر ان کے دلوں کی دھڑکنیں سنی نہیں جاتیں، الٹا یہ ہوتا ہے کہ عوام کسی مسئلے پر جب مطالبات لے کر اٹھتے ہیں اور ان کے اضطراب کی لہریں ملک کے گوشے گوشے سے آ آ کر ایوانِ اقتدار سے ٹکراتی ہیں تو ایوان کے دروازے بند کر لیے جاتے ہیں۔ کیا سلہری صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ دستور کے مسئلے پر پوری قوم نے یک آہنگی سے پچھلے سات سالوں میں کیا تمنائیں دستور یہ اور حکمران پارٹی کے سامنے رکھی ہیں؟ کیا سلہری صاحب ناواقف ہیں کہ مارشل لاء کے اسیروں کے بارے میں ملک کی کوئی تنظیم اور کوئی بستی ایسی نہیں رہی جس کی طرف سے صریح بے انصافی کے ازالہ کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو؟ پھر ان اصل اتھارٹی اور اختیار رکھنے والے عوام کو کیا جواب ملا؟

اب تو عوام کے متعلق ذمہ دار ترین لوگوں کی طرف سے کھلم کھلا یہ کہا جانے لگا ہے کہ یہ جمہوریت کے اہل نہیں، معاملات کی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے، مذہبی رَو میں بہہ جاتے ہیں اور بہکانے والوں کے ہاتھوں میں کھیل جاتے ہیں۔ جن عوام کو یہ سنہرا سرٹیفکیٹ دیا جا رہا ہو، ان بیچاروں پر فائنل اتھارٹی ہونے کا الزام بہت ہی بڑی زیادتی ہے۔ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی ؎ چاہتے ہیں جو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا ۔۔۔ یہ اگر آپ لوگوں کی ہر بات پر ایمان لے آیا کریں تب تو یہ فائنل اتھارٹی ہونے کے حق دار ہوں بھی، لیکن جب یہ اپنے مذہب کو سینے سے لگائے ہوئے ہوں اور کوئی صدائے اختلاف بلند کر دیں تو پھر یہ جمہوریت سے نوازے جانے کے مستحق ہی نہیں رہتے۔

فی الواقع اگر آپ لوگ عوام کو آخری فیصلہ کن طاقت قرار دیتے ہیں تو آئیے، آج آئیے اور اپنے نظریات و تصورات کو آپ ان کے سامنے رکھ دیجیے اور دوسری طرف تمام دوسرے لوگوں کو موقع دیجیے کہ وہ بھی اپنے اپنے نظریات و تصورات پیش کر دیں۔ ایک کھلے کھلے استصواب رائے کے ذریعے فیصلہ کرا لیجیے کہ آخری فیصلہ کن طاقت کس کو قبول کرتی ہے اور کسے رد کرتی ہے۔

(۳)

اب بحث کا تیسرا حصہ سامنے آتا ہے اور اصل نتیجہ برآمد ہوتا ہے، یا یوں کہیے کہ جو سبق سلہری صاحب پاکستان کو دینا چاہتے ہیں وہ اس حصے میں دیا جا رہا ہے۔ اس نتیجے یا سبق کے دو جز ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام کے نام پر سیاست کے میدان میں کسی کو کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ کسی کے نظریات دوسروں پر ٹھونسے نہ جائیں۔ بحث کے حصے میں بھی ان دو نکات کو پیش کرتے ہوئے ایسی باتیں کہی گئی ہیں کہ جن کا ناقدانہ جائزہ لینا مفید ہو گا۔

سیاسی تنظیمیں اسلامی نہ ہونی چاہئیں سلہری صاحب بتاتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کو باہم دگر اختلاف و تنقید سے کام لینا پڑتا ہے

اور اس بنا پر لیسا اوقات برا بھلا کہنا پڑتا ہے۔ مثلاً انگلستان کے ٹوری سوشلسٹوں کو انتشار پسند (ANARCHIC) اور نظم دشمن قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف سے پلٹ کر اعتدال پسندوں (CONSERVATIVES) کو خون چوسنے والے سرمایہ دار کہا جاتا ہے۔ اب بڑا پیچیدہ مسئلہ یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ایک سیاسی تنظیم اسلام کی علمبردار بن کے اٹھے، مثلاً جماعت اسلامی تو وہ اپنے مخالفین کو کیا کہے گی؟ جس گالم گلوچ سے یہ اپنے دائرے سے باہر کے لوگوں کی تواضع کرسکتی ہے وہ کافر اور ملحد کہنے کے علاوہ اور کیا ہوگی! یہ پیچیدہ مسئلہ پیش کرتے ہوئے سلہری صاحب اس کے عملی ثبوت کے طور پر یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی آئے دن اختلاف کرنے والوں کے لیے یہی کلمات استعمال کرتی رہتی ہے، چنانچہ مسودۂ دستور میں ترمیم چاہنے والوں کے خلاف اس کے ترجمان نے ٹھیک یہی انداز اختیار کیا تھا۔

پہلے اس عملی ثبوت کے بارے میں بات کرلینا ضروری ہے۔ مارچ ۵۳ء میں مسودۂ دستور میں ترمیم کرانے کے لیے نہیں بلکہ دستور کو توڑ دو کا مشہور نعرہ متحدہ محاذ کی طرف سے اٹھا تھا۔ اس نعرے کے بارے میں خود مسلم لیگی اور سرکاری اور قوم پرست حلقوں نے بھی یہ تاثر دیا تھا کہ یہ کچھ کمیونسٹوں، تخریب پسندوں، مفاد پرستوں اور اسلامی دستور کے مخالفوں کا اٹھایا ہوا نعرہ ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ کمیونسٹ اور اسلامی دستور سے چڑنے والے عناصر جہاں جہاں بھی تھے انھوں نے اس کی تائید میں پورا زور صرف کیا تھا۔ جماعت اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے ایک قرارداد میں اس تخریبی نعرہ کی تردید کرتے ہوئے اس کے علمبردار عناصر کو محض ایک واقعہ ہونے کی حیثیت سے پیش کر دیا تھا کہ یہ آواز کیسے لوگوں کی ہے۔ درحقیقت اس انتباہ کا مقصود صرف یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے اٹھائے ہوئے نعرے کی گہرائیاں عام لوگ سمجھیں اور کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، نہ یہ کہ جو کوئی بھی اخلاص یا غلط فہمی کے تحت اسے اختیار کرتا جائے۔ اس پر ایک مذہبی گالی چسپاں ہوتی چلی جاتے۔ دوبارہ یہی نعرہ اکتوبر میں اٹھا تو پھر اس کی پہلی "ہُو" انھی صفوں سے بلند ہوئی جن کو مارچ سے لوگ جانتے تھے۔ اب یہ تو "اسرار درون پردہ" کا معاملہ تھا کہ اقتدار کے لیے کشمکش کرنے والے دو دھڑوں میں سے ایک نے اندر ہی اندر اس ردّ شدہ نعرے سے کوئی مفید کام لینے کا فیصلہ کرلیا۔ اب اس نعرے کے جھنڈے تلے بڑے بڑے حضرات کا جو انبوہ جمع ہوگیا تھا ان میں سے ہر ایک خواہ مخواہ ان الفاظ کو اپنے اوپر اوڑھ کر مظلومی کی شان سے سامنے آتا ہے کہ دیکھیے جماعت اسلامی والے اپنے سوا دوسروں کو ملحد اور کمیونسٹ کہتے ہیں۔ بھائی کسے معلوم تھا کہ آپ جیسے اسلام نواز حضرات بھی اب اس جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے جیسے گاڑنے والوں نے جب گاڑا تھا تو خود آپ ہی کی صفوں سے ان کو کمیونسٹ اور ملحد کہا گیا تھا۔

اب لیجیے، جماعت اسلامی کی روش کو۔ جماعت کا طریقہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مجرد اختلاف کرنے کی بنیاد پر کسی بھی مومن کو کافر یا ملحد یا کچھ اور کہے۔ وہ اپنے آپ سے ہر فرد بشر کو اختلاف کا کھلا حق دیتی ہے، اور دوسروں کے مقابلے میں یہی حق اپنے لیے چاہتی ہے۔ اختلاف جیسا کسی سے ہوتا ہے، اسی کے مطابق وہ اس کی فکری پوزیشن کو بیان کر دیتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی جمہوریت کے کسی اصول سے انحراف کرتا ہے تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ جمہوریت کی مخالفت ہے۔ قانون وعدل کے صریح تقاضوں سے کوئی روگردانی کرتا ہے تو وہ فقط یہی کہتی ہے کہ یہ انصاف اور قانون کا عدم احترام ہے۔ کوئی معاشی دائرے میں استحصال کرتا ہے تو وہ یہ کہتی ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ یا جاگیردارانہ اطوار ہیں۔ نہ یہ کہ وہ ہر اختلاف پر دوسروں کو کافر اور ملحد کہہ ڈالتی ہو۔ پھر جہاں تک تکفیر کے الزام کا تعلق ہے، اس سے جماعت کا دامن قطعاً پاک ہے۔ "ملحد" اور "کمیونسٹ" کے الفاظ البتہ ایسے ہیں جو اپنے ناگزیر موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں۔ الحاد اس کو کہتے ہیں کہ اسلام کو مانتے ہوئے آدمی اس میں ٹیڑھ نکالے اور انحراف کی کھلی کھلی صورتیں اختیار کرے۔ اب سلہری صاحب اپنے معاشرے کو سامنے رکھ کر بتائیں کہ کیا یہاں مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ ایسے بے شمار افراد موجود نہیں ہیں جو اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، اسلامی نظام کو ڈھکوسلہ سمجھتے ہیں، اسلام کے دستوری تصورات پر پھبتیاں کستے ہیں، اس کے عملی تقاضوں سے فرار کرنا چاہتے ہیں اور اس کے اجتماعی مطالبات کو رد کرتے ہیں؟ اگر سلہری صاحب چاہیں تو ہم نام لے کر ان ممتاز ہستیوں کا تعارف کرا دیں جو پاکستان کے اسلامی ریاست قرار پانے کی صورت میں شرم کے مارے اپنی گردن دنیا کے سامنے اٹھانے کے قابل نہیں رہتے، جو "قرارداد مقاصد" کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھنے والے ہیں کہ جیسے پاکستان کے دامنِ عزت پر کوئی گھناؤنا دھبہ لگ گیا ہے، جن کا حال یہ تھا مسودۂ دستور میں ریاست کے تسمیہ (NOMENCLATURE) کی دفعہ نے جب پاکستان کا نام "جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان" تجویز کر دیا تو وہ پیچ و تاب کھاتے رہ گئے۔ آخر جب یہ عنصر ہمارے ہاں موجود ہے اور جب کمیونسٹوں کی ایک تعداد یہاں کام کر رہی ہے تو کوئی بھی کام کرنے والی جماعت ان کے موجود ہونے سے کیسے آنکھیں بند کر سکتی ہے اور کیسے ان کی حرکات سے چشم پوشی کر سکتی ہے۔ یہ عناصر اگر کوئی اقدام اپنے نظریات کے مطابق کریں گے تو اس کام کو انھی سے منسوب کیا جائے گا، نہ یہ کہ ملحد اور کمیونسٹ عناصر کے کارناموں کو جمعیت العلماء اور مسلم لیگ کے نام سے بیان کیا جائے۔ ان عناصر کے لیے آخر آپ کونسا نام تجویز کر کے دیتے ہیں کہ اس سے ان کو موسوم کر کے بات کی جائے۔

اصل الجھن جس وجہ سے پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر طرزِ فکر اور ہر مسلک کے لوگ اپنے آپ کو جرأت کے ساتھ ایسے نام سے پیش کرتے اور ایسے نام سے موسوم ہونا چاہتے ہیں جو ان کے طرزِ فکر اور مسلک کو ظاہر کرتا ہو۔ لیکن ہماری صفوں میں ملحد اور کمیونسٹ، دونوں ہی عنصر یہ عجیب پوزیشن اختیار کر کے رہنا چاہتے ہیں کہ وہ خیالات، طرزِ عمل اور سرگرمیوں کے لحاظ سے تو الحاد اور کمیونزم کے علمبردار ہیں لیکن اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے اپنے آپ کو ملحد اور کمیونسٹ کے نام سے سامنے نہیں لاتے۔ اب اگر کوئی دوسرا ان کے خیالات اور مسلک کے نام سے ان کا صحیح نام لے دیتا ہے تو وہ اس کے گلے پڑ جاتے ہیں کہ تم اختلاف کرنے والوں کو گالی دیتے ہو! معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایک مسلم معاشرہ میں اپنا کام منافقت کی ایک نقاب ڈال کر جاری رکھنا چاہتے ہیں اور اگر کوئی اس نقاب کو سرکاتا ہے تو یہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں ــــ اسلامی نظام کے خلاف صریح طور پر بغض رکھنے والے، اسلامی دستور کا ذکر چھیڑتے ہی پسینہ پسینہ ہو جانے والے اور کتاب و سنّت کا نام آتے ہی اشتعال پذیر ہو جانے والے سب کے سب یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات اور طرزِ فکر کے لحاظ سے ہرگز نہ پہچانے جائیں، بلکہ اسلام کے مخلص ترین خادموں میں شمار ہوں سلہری صاحب! یہ پردۂ منافقت ہے جو اصل پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ یہ ہٹا دیجیے تو کوئی الجھن نہیں ہو گی۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو صاف صاف طریق سے اگر اسلامی نظام کی دعوت کے ساتھ لا رہے ہیں، تو کیوں نہ کچھ دوسرے لوگ کھلم کھلا اسلامی نظام کی مخالفت کا علم اٹھا کے میدان میں کام کریں اور کہیں کہ ہم ملحد اور کمیونسٹ ہیں، ایک مادہ پرستانہ سیکولر نظام چاہتے ہیں، ہمیں اسلام وغیرہ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ یوں اگر رائے عام کے کھلے میدان میں مسابقت رہے تو بہت آسانی سے اِدھر یا اُدھر فیصلہ ہو سکتا ہے۔

"جماعت اسلامی" کا نام بحث کا یہ پس منظر بنا چکنے کے بعد سلہری صاحب جماعت اسلامی کے نام پر اعتراض اٹھاتے ہیں اور وہ شاندار استدلال کرتے ہیں کہ آدمی عش عش کر اٹھتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس نام کے معنی یہ ہیں کہ جماعت کے علاوہ دوسرے تمام لوگ اسلام کے دائرے سے باہر ہو گئے۔ جی ہاں! مسلم لیگ نام کی اگر ایک جماعت موجود ہو تو وہ گویا یہ کہتی ہے کہ اور جتنی بھی جماعتیں ہیں وہ مسلمانوں کی نہیں غیر مسلموں کی ہیں۔ اگر ایک جمعیت العلماء موجود ہو تو وہ گویا اپنے نام کے ذریعے یہ اعلان کرتی ہے کہ باقی سب جمعیتیں "جہلاء" کی ہیں۔ کوئی ادارہ خدمتِ خلق موجود ہو تو گویا یہ نام رکھ کر وہ دوسرے تمام اداروں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ سب خدمتِ نفس کے ادارات ہیں۔ اسلامیہ کالج اگر کوئی

پایا جائے تو وہ گویا پکار پکار کر دوسرے تمام کالجوں کا غیر اسلامی ہونا واضح کرتا ہے۔ "طلوعِ اسلام" نام کا کوئی جریدہ نکلے تو اس کا سرورق گویا دوسرے تمام جرائد کو "طلوعِ کفر" کا افق قرار دیتا ہے۔ اداروں اور جماعتوں کو چھوڑ کر اسی دلیل سے افراد کو لیجیے تو ماننا پڑے گا کہ اگر کسی شخص نے اپنا نام غلام محمد رکھ لیا ہو تو گویا وہ دوسرے کروڑوں بھائیوں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ محمدؐ کے نہیں، کسی اور کے غلام ہیں۔ اگر کسی کا نام عبداللہ ہو تو وہ دوسروں پر بالواسطہ طریق سے یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ عباد الشیطٰن ہیں۔ کوئی شخص اگر "سعادت" اپنا تخلص اختیار کر لے تو باقی دنیا پر نحوست کا تخلص خواہ مخواہ چپک جائے گا۔ یہ دلیل بازاری سطح کے لوگوں سے تو پہلے بھی سنی تھی لیکن اس پر بڑی مایوسی ہوئی کہ پاکستان کا ایک ممتاز اخبار نویس بھی اس کو ایک برہانِ قاطع بنا کے لے آیا۔ اس برہانِ قاطع کی بنیاد پر سلہری صاحب چاہتے ہیں کہ "جماعت اسلامی" کے نام کو ممنوع (BAN) ٹھہرا دیا جائے۔ دلچسپ امر یہ کہ وہ یہ بھی اجازت مرحمت فرماتے ہیں، بلکہ کچھ اصرار بھی کرتے ہیں کہ ہماری جماعتوں کا پروگرام اسلامی اصول و مقاصد سے مالامال ہونا چاہیے' لیکن بس وہ "اسلامی" نہ کہلائیں۔ مٹھائی بنائیے، اس میں شکر ضرور ملائیے، اسے خوب میٹھا کر لیجیے لیکن اس کا نام مٹھائی نہ رکھیے۔ بلکہ حنظل رکھیے ورنہ اگر آپ نے اپنی مٹھائی کا نام کہیں مٹھائی رکھ لیا تو آپ دوسروں کی مٹھاس کی نفی کرنے کے مجرم بن جائیں گے۔ آپ ایلوپیتھک دواؤں کی دکان کھولیں تو اس کے بورڈ پر یہ واضح نہ کریں کہ یہاں ایلوپیتھک دوائیں ملتی ہیں، بلکہ باہر یہ لکھیے کہ یہاں سے بھوسہ اور چارہ مل سکتا ہے۔

دنیا میں نام ہمیشہ حقیقتِ شئے کو واضح کرنے کے لیے تجویز کیا جاتا ہے۔ پارٹیوں اور جماعتوں کے نام ان کی فکر اور ان کے پروگرام کو پیش کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر دنیا میں یہ لطائف کبھی نہیں پیش آئے کہ کمیونسٹ، سوشلسٹ، جمہوری یا کسی اور نظریہ کی جماعت کو مطابقِ حقیقت ناموں سے موسوم کرنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہو تو آخر ایک اسلامی نظریہ رکھنے والی تنظیموں ہی کے لیے یہ طرفہ قانون کیوں گھڑ لیا جائے۔ کب جماعتِ اسلامی نے آپ کو منع کیا ہے کہ آپ اگر اسلامی نظریہ پر کام کرنا چاہیں تو اپنی کسی تنظیم کو اسلام سے منسوب نہ کریں۔ اسلامی نظریہ کی علمبردار اگر یہاں درجنوں جماعتیں بھی ابھر آئیں تو وہ ایک مقصد کے خادموں کی متعاون ٹیمیں بن کر کیوں نہیں کام کر سکتیں! ہم تو سلہری صاحب کو دعوت دیں گے کہ وہ جس تصور کے ساتھ بھی اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہوں بسم اللہ کریں اور ایک اور اسلامی جماعت کی بنیاد ڈال دیں۔ اس میں جماعت اسلامی کا نام بے چارا کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ اگر حقیقتِ شئے کو کسی بے ڈھنگے نام سے

موسوم کردیا جائے تو بالآخر وہ نام خود ہی اپنے معنی بدل دیتا ہے، مثلاً اگر جماعت اسلامی کا نام آپ کوہ ہمالیہ بھی رکھ دیں گے تو خود لفظ کوہ ہمالیہ کے معنی ایک دن جماعت اسلامی ہو کے رہ جائیں گے۔

جماعتوں کو خلاف قانون قرار دینے کے معنی لیکن اصل مدعا نام کو نہیں، بلکہ اس نام کے بہانے جماعتِ اسلامی کی تنظیم اور تحریک کو خلاف قانون قرار دلوانے کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ سلہری صاحب شوق سے یہ مہم شروع کریں لیکن وہ اپنے مرتبے کا کچھ تھوڑا بہت لحاظ کر کے یہ سوچیں کہ اس قسم کی بات زبان پر لانے کے معنی کیا ہیں۔ ایک جماعت کو خلاف قانون قرار دینا درحقیقت اس کے قتل کا معنی رکھتا ہے۔ جماعت کا قتل ایک نظریے، ایک نصب العین اور ایک پروگرام کو پھانسی دینا ہے۔ آخر وہ یہ پھانسی کس بنیاد پر کسی کو دلوانا چاہتے ہیں ــــ محض اختلافِ رائے کے گناہ پر! تو پوزیشن وہی ہوئی جیسے کسی علاقے کا کوئی جابر جاگیردار جب یہ دیکھتا ہے کہ فلاں خوددار آدمی چونکہ میرے دربار میں آکر میری ہاں میں ہاں نہیں ملاتا اور برسرِ عام مجھ سے اختلافِ رائے ظاہر کرتا ہے تو وہ پیچ و تاب کھا کر اس کے قتل کرانے کی سازش پر اتر آتا ہے۔ خود قتل نہیں کر سکتا تو کسی دوسرے کی منت سماجت کرتا ہے کہ کسی طرح یہ کانٹا نکال دو۔ سلہری صاحب غور کریں کہ اگر ایسی پوزیشن کو وہ اختیار کرنے والے تھے تو آخر پورے اداریے میں جگہ جگہ آزادی رائے کا وعظ کہنے کی تُک کیا بیٹھی؟

رواداری کی ضرورت پر اتنا کچھ کہہ ڈالنے کے معنی کیا رہے؟ جمہوریت نوازی کے سارے حوصلوں کی پرواز بس اتنی ہی تھی؟

جاگتے ہوئے ضمیر کے ساتھ سوچیے کہ آخر ان یہودیوں کی کرتوت آج ہم سے کس بنا پر خراجِ نفرین وصول کرتی ہے جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے لیے سولی کی سزا تجویز کی تھی؟ ان جبارانِ زمانہ کے کارناموں کو آج ہم حقارت کی نگاہ سے کیوں دیکھتے ہیں جنھوں نے انسانیت کے بہترین خادموں کو استبداد کے کولھو میں پیل دیا تھا؟ یورپ کے قرونِ مظلمہ کے ان تنگ دل حکام اور پادریوں کو ہم کیوں کوستے ہیں جنھوں نے گلیلو اور نیوٹن جیسے اہلِ فکر پر جینا تنگ کر دیا؟ ہم ان یونانیوں کو کیوں کڑھن کے ساتھ یاد کرتے ہیں جنھوں نے سقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر دیا؟ ہم ان علمائے سُو کا نام کیوں ذلت آمیز طریق سے لیتے ہیں جنھوں نے مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں بیٹھ بیٹھ کر ہر اختلاف کرنے والے کے خلاف فتوے لگائے، چغلیاں کھائیں اور قابو چل گیا تو اس کو موت یا قید خانے کے حوالے

کوئی کے چھوڑا ؟ ان لوگوں کا گناہ صرف تنگ نظری اور کوتاہ ظرفی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اختلاف کی برداشت اپنے اندر پیدا کرنے کے بجائے یہ پسند کیا کہ انسانیت کے جو اونچے سے اونچے خادم ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں ان کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ ان لوگوں نے کلمۂ حق کہنے والوں، آزادئ رائے کا مظاہرہ کرنے والوں اور تنقید کی صدا بلند کرنے والوں کے خلاف طرح طرح کے بہانے تراشے، بچگانہ استدلال گھڑے، نئی سے نئی منطقیں ایجاد کریں، مذہب اور قانون کی حسب منشا کوئی تعبیر پیدا کر لی اور منتخب روزگار ہستیوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔

اب دیکھیے کہ یہ آپ کا طبقہ ہے کہ جس کے قبضے میں تخت و تاج ہے۔ خزانے اور ذرائع و وسائل ہیں نشر و اشاعت کی طاقتیں ہیں، ریڈیو اور پریس ہے، پشت پر واحد نمائندہ جماعت ہے، حمایت میں بے شمار دماغ ہیں، پھر استبدادی قوانین و اختیارات ہیں، پولیس اور فوج ہے۔ دوسری طرف جماعت اسلامی ہے کہ جو تھوڑی سی تعداد ارکان اور ان کی جیبوں سے نکلی ہوئی محدود سی رقوم اور ایک روزنامہ اور دو چار ماہانہ اور ہفتہ وار جرائد کے بل پر ایک فکر پیش کر رہی ہے۔ اگر اس کی فکر غلط اور باطل ہے اور اس کا پروگرام مہلک ہے اور وہ واقعی نامعقول طریقوں سے کام لے رہی ہے تو آخر آپ کے اس طبقہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ رواداری کی کھلی فضا میں اتنی ہمہ گیر طاقتوں سے کام لے کر اسے شکست نہیں دیتا۔ دلیل کے میدان میں کسی جماعت یا تحریک کو شکست دے دی جائے تو پھر چاہے چند سر پھرے آدمی اس سے کتنے ہی چمٹے رہیں وہ حالات پر اثر انداز ہونے کے قابل نہیں رہتے اور آہستہ آہستہ فاتح خیالات کی طاقت ان کو دھکیل کر زندگی کے بعید ترین گوشوں میں بٹھا دیتی ہے۔ مگر اب کیا آپ لوگ دلیل کا میدان واقعی چھوڑ چکے ہیں کہ نوبت جماعت اسلامی کے قتل کے بہانے پیدا کرنے تک آ پہنچی ہے۔ دنیا کے جس گوشے میں آپ کا یہ اداریہ پڑھا جائے گا، اغیار پاکستان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ ہمارے معیارِ جمہوریت اور ہمارے ہاں کی رواداری اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے ظرف کے بارے میں لوگ کیا اندازے باندھیں گے؟

سوچیے، اور ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ آپ کا یہ حکمران طبقہ وہ ہے کہ جس کی طرف سے جماعت اسلامی کو پچاسوں بار غدار اور تخریب پسند کہا جا چکا ہے اور انڈیا، روس اور امریکہ میں سے ہر ایک کا روپیہ پروپگنڈا کی حد تک کئی کئی بار دلوایا جا چکا ہے۔ ہم تو یہ سب کچھ سہتے چلے آ رہے ہیں، بلکہ اس سے اوپر یہ کہ سیفٹی ایکٹ کے وار، پھانسیوں اور قید کی سزائیں، ضبطیاں اور زبان بندیاں اور قلم بندیاں سب کچھ صبر سے بھگت رہے ہیں، لیکن دوسری طرف ایک "جماعت اسلامی" کا نام

اتنی ناقابلِ برداشت چیز ہو گیا ہے کہ آپ جیسے ممتاز صحافی اسے خلاف قانون قرار دینے کے دلائل ادارتی صفحات میں پیش کرنے لگے ہیں۔ خدارا سوچیے کہ آج جو تاریخ بن رہی ہے اس میں اپنے لیے کیا مقام آپ پیدا کر رہے ہیں۔

مغرب زدہ ذہن سلہری صاحب کی اس جرأت کی ہمارے دل میں بہت قدر پیدا ہوئی کہ آپ نے اس بات کا صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ ذہنوں پر غیر ملکی راج اور مغربی فکر و تہذیب کا گہرا اثر موجود ہے۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقہ اور معاشرہ کے تعلیم یافتہ عنصر کا اس پہلو سے ڈیفنس کرنے کے بعد فوراً آپ نے دوسری جانب جارحانہ حملہ کر دیا ہے۔ یعنی مذہبی لوگوں کو جدید علوم سے بے بہرہ اور حالات کے تقاضوں سے ناآشنا قرار دے دیا ہے۔ اس موقع پر بھلا مولانا مودودی کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ مولانا احتشام الحق کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی کا نام لے کر ان کی علمی حیثیت پر استفہامِ انکاری فرمایا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس سطح پر جا نہیں سکتے کہ کسی کی جہالت اور کسی کی علمیت کا ناپ تول کر سکیں۔ علم اگر کہیں ہو گا تو اپنا اعتراف خود کرائے گا، نہیں ہو گا تو محض نام کے سکے دیر تک نہیں چل سکتے۔ رنج ہوتا ہے کہ یہاں آ کر سلہری صاحب نے ایسی پوزیشن اختیار کی ہے کہ جیسے دو طبقوں کا کوئی طبقاتی جھگڑا ہے اور سلہری صاحب ایک طبقے کے بالمقابل دوسرے کا دفاع کر رہے ہیں۔ اگر حالات کو انہوں نے واقعی اسی طرح سمجھا ہے کہ یہ ملّا اور مسٹر کی کشمکش ہے تو قطعی طور پر غلط سمجھا ہے، کم سے کم جماعت اسلامی کی حد تک اگر ان کو پہلے سے معلومات نہیں ہیں تو ہم عرض کریں گے کہ اس کی صفوں میں دونوں طرف کے لوگ آ کر جمع ہوئے ہیں، بلکہ جدید طبقے کے حلقوں سے نسبتاً بہت زیادہ تعداد میں لوگوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم لوگ بعض اوقات معیاری علماء کی تعداد کی کمی کو شدّت سے محسوس کرتے ہیں۔ یہی بیّن ثبوت ہے، اس بات کا کہ کشمکش طبقاتی نہیں ہے، ورنہ جماعت اسلامی کے لیے جدید طبقوں کے دروازے طبقاتی تعصب نے کبھی کے بند کر دیے ہوتے۔ معاملہ درحقیقت نہایت زوردار تاریخی تقاضوں اور مستقل نظریوں کی کشمکش کا ہے جسے ہم آخر میں مختصراً واضح کریں گے۔

خیر، اسی سلسلے میں فاضل مدیر اقبال کا ذکر چھیڑتے ہیں کہ ایسے چوٹی کے لوگ تو شاذ ہی ہو سکتے ہیں جو ایک ماحول میں پرورش پا کر اور ایک نظامِ تہذیب کے تحت تعلیم حاصل کر کے اٹھیں اور پھر آزاد ذہن کے ساتھ اسی کی کمزوریوں کی نشان دہی کرتے اور اس کے بالمقابل ایک نئی فکر پیش کرنے کا کارنامہ انجام دیں۔ سب لوگ واقعی اس درجے کے نہیں ہو سکتے لیکن قدرت ایسے ممتاز افراد سے قوموں کو اسی لیے نوازتی ہے کہ اوسط درجے کے دل و دماغ جو از خود ماحول اور وقت کی

تہذیب کے کمزور پہلوؤں کو نہیں سمجھ سکتے اور ان سے اوپر اٹھنے کے لیے کوئی فکر از خود حاصل نہیں کر سکتے، وہ خاص خاص تاریخی شخصیتوں کی فکر سے اپنے چراغ روشن کریں۔ لیکن آپ اقبال کو اٹھا کر غیر معمولی پن کے اونچے طاق میں رکھ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے اپنے آپ کو ماحول اور تاریخ کے حوالے کر دیتے ہیں کہ ہر کوئی اقبال تو نہیں بن سکتا۔ بلاشبہ ہر کوئی روسو اور مانٹسکیو اور گاندھی اور محمد علی جناح نہیں بن سکتا، مگر ان سے فکر و عمل کا درس تو لے سکتا ہے۔

اقبال مرحوم کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ملّتِ اسلامیہ کے اس دوگونہ تاریخی ردِّ عمل کو سمجھ کر اپنے کلام میں جذب کر لیا جو گذشتہ ایک صدی سے مغرب کے سیاسی و تہذیبی غلبے کے تحت پروان چڑھا۔ ایک طرف اس نے دورِ جدید کے مطالعہ سے علم و عمل کے میدانوں میں ترقی کرنے، حالات سے کشمکش کرنے، قوتوں کو مسخر کرنے، جدید ذرائع و وسائل سے کام لینے اور جدید ادارات سے استفادہ کرنے کا وہ سبق لیا جو خود اسلام کا پڑھایا ہوا سبق تھا۔ دوسری طرف اس نے نظامِ حیات کی بنیاد بنانے کے لیے مغرب کی مرعوبیت سے بالاتر ہو کر اسلامی اصولِ فکر کو بغیر کسی ندامت و معذرت کے اپنایا۔ یہ دونوں تاریخی رجحانات خود ملّتِ اسلامیہ کے اندر مغربی غلبے کے ردِّ عمل سے پیدا ہو کر نمایاں ہو رہے تھے مگر دھندلے اور نیم شعوری تھے۔ اقبال نے ان کو اجاگر کر دیا اور اس طرح اس کے کلام نے تعمیرِ نو کے لیے ایک صحیح راستے کی نشان دہی کر دی۔ اس لحاظ سے اقبال کو دیکھیں تو وہ ہمارے قدیم مذہبی طبقے اور جدید روشن دماغ طبقے کے درمیان ایک ایسے وسطی مقام پر کھڑا نظر آتا ہے جہاں دونوں اپنے آپ کو لا کر جمع کر سکتے ہیں اور ملّت کی ساری طاقت یک جہتی سے تعمیرِ نو میں لگ سکتی ہے۔

اقبال اس وسطی مقام پر کھڑے ہو کر ایک فکری تحریک کر کے رخصت ہو گیا۔ بعد میں ٹھیک وہی موقف ہے جسے عملی تحریک کے میدان میں جماعت اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ ورنہ اگر معاملہ مسٹر اور مُلّا کی طبقاتی کشمکش تک رہ گیا ہوتا تو اس سے پہلے دونوں طرح کی جماعتیں اور ادارات موجود تھے، تاریخ میں کوئی خلا نہ تھا۔ کسی جماعت اور تحریک کے لیے اگر خلا رہتا تو اسی ضرورت کے لیے تھا کہ دونوں قسم کے متصادم رجحانات کے درمیان کوئی طاقت اقبال کا نشان زدکردہ مقامِ اعتدال سنبھال کے کھڑی ہو۔ چنانچہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی ایک طرف جدید علوم میں آگے بڑھنے، جدید ادارات سے استفادہ کرنے اور جدید ذرائع و وسائل کو کام میں لانے اور گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے اور ان کا لحاظ رکھنے کا مسلک اختیار کیے ہوئے ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ تعمیرِ نو اسلامی فکر و اصول

کی اساس پر ہو۔ پس درحقیقت جماعت اسلامی ایک تاریخی تقاضے کا ظہور ہے اور یہ تاریخی تقاضا اتنا ملت گیر ہے کہ ہر ملک میں یہ کسی نہ کسی تحریک کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے۔ اتنی بات البتہ درست ہے کہ یہ ہمہ گیر تاریخی تقاضا رائے عام کی پوری تائید اپنے ساتھ لے کر جس بھی شکل میں جہاں نمودار ہو رہا ہے، حکمراں کلاس بہت برافروختہ ہو کر اس سے لڑ رہی ہے یعنی معاملہ مسٹر اور ملا کی کشمکش کا نہیں، بلکہ عوامی رجحانات اور حکمراں کلاس کی کشمکش کا ہے۔ کاش کہ اگر یہ طبقہ کشمکش کا راستہ اختیار نہ کرے تو تعاون کے لیے خطِ اعتدال سامنے موجود ہے۔

ایک متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی اس سلسلے میں فاضل مدیر نے "ایک متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی" دینے پر اعتراض کیا ہے موصوف کی رائے یہ ہے کہ بس لوگ قرآن پڑھیں اور جدید علوم کے حصول میں لگ جائیں، جوں جوں افراد کے خیالات بنیں گے، ریاست اور معاشرہ ان کے ذریعے خود بخود اپنے آپ کو کسی شکل میں تعمیر کرتا جائے گا۔ اس سلسلۂ کلام میں آپ فرماتے ہیں کہ کسی صورت میں بھی ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ آنے والی نسلوں کو نام نہاد اسلامی قوانین کی بیڑیوں میں جکڑ جائیں اگر آپ ان بیڑیوں میں آئندہ نسلوں کو جکڑ جانے کا حق نہیں رکھتے تو آخر نام نہاد غیر اسلامی قوانین کی بیڑیوں میں جکڑ جانے کا حق کہاں سے حاصل ہو جاتا ہے! پھر تو چاہیے کہ آپ معاملہ بالکل ہوا میں معلق چھوڑ دیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا آئندہ نسلوں کے نام پر موجودہ نسلوں کو ان قوانین سے محروم رکھنا برحق ہو گا جس پر وہ ایمان رکھتی ہیں اور جن کو فلاح و بہبود کا ضامن سمجھتی ہیں آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں موجودہ نسلیں ان پر ایمان نہیں رکھتیں۔ لیکن اس اختلافِ رائے کا فیصلہ کون کرے گا؟ — اگر وہی عوام فیصلہ کرنے والے ہیں جن کو آپ آخری اتھارٹی قرار دیتے ہیں تو ہم عرض کریں گے کہ براہِ کرم اپنا یہی فقرہ، بلکہ اپنے یہ الفاظ "نام نہاد اسلامی قوانین کی بیڑیاں" قوم کے سامنے پیش کر کے استصواب کر لیجیے کہ کتنے افراد اس طرز کے پائے جاتے ہیں جو اس طرز پر سوچتے ہیں اور یہ الفاظ اسلامی قوانین کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ان الفاظ میں جو ذہن بول رہا ہے، عوام کے کتنے ووٹ اس ذہن کے حق میں پڑ جائیں گے۔ لیکن آپ کی توجہ ان الفاظ کو لکھتے وقت عوام کی طرف کبھی نہیں ہو سکی، آپ نے تو اپنی طرف سے ایک قطعی فیصلہ دے دیا ہے اور انداز ایسا ہے کہ اسے زبردستی ملک بھر پر ٹھونسنا چاہتے ہیں

"متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی" کا معاملہ یہ ہے کہ جب تک کوئی بات محض خطابت و صحافت کے میدان میں کی جاتی رہتی ہے، قطعیت اور تعین کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن جب معاملہ دستور بنانے، تعمیرِ معاشرہ کا خاکہ تیار کرنے اور ایک سیاسی نظام برپا کرنے کا ہوتا ہے تو ڈھیلی ڈھالی باتوں کو قطعیت اور تعین کی طرف لانا پڑتا ہے۔ اگر کوئی صاحبِ فکر

ودعوت خود تعین کی طرف نہ جانا چاہیے اور محض اصولی گفتگو تک اپنے آپ کو محدود رکھے تو مخاطب خود تعین کا تقاضا کرتا ہے۔ مثلاً یہی صورت عملاً جماعت اسلامی کو پیش آئی۔ اس نے کہا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جانا چاہیے۔ اس پر سوال ہوا کہ تفصیل سے بتایئے کہ وہ ہوتا کیا ہے۔ ادھر سے کہا گیا کہ دستور کو اسلامی بنیادوں پر بننا چاہیے۔ دریافت کیا گیا کہ وہ اسلامی بنیادیں کیا ہوتی ہیں۔ چاہا گیا کہ معاشی مفاسد کی اصلاح اسلامی نظریات کے مطابق کی جائے۔ اس پر پوچھا جانے لگا کہ وہ اسلامی نظریات کیا ہیں اور ان سے معاشی مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں۔ پھر جب دعوت دی گئی کہ سود کو حرام ہونا چاہیے تو جرح ہوئی کہ اس کے بغیر بنکنگ سسٹم کے لیے کیا نقشہ دیتے ہو۔ اسی طرح کرید اور تفحص اور کثرتِ سوال نے آہستہ آہستہ پھیلے ہوئے نظریات کو تعین تک پہنچایا ہے اور یہ بالکل فطری صورت دورِ تعمیر میں دنیا کے ہر گوشے اور زمانے میں پیش آئی ہے۔ خود ہی آپ لوگوں نے پہلے اس تعین کے لیے ہر معاملے میں اصرار کیا اور اب خود ہی طعنہ دیتے ہیں کہ ہمیں کوئی متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی نہیں چاہیے۔ ہم تو گول مول باتیں پسند کرتے ہیں۔ گول مول باتوں سے تعمیر نہیں ہوتی۔ ایک متعین رہنمائی آپ کو پسند نہیں آئی تو آپ کوئی دوسری متعین رہنمائی بہم پہنچائیں اور پھر فیصلہ عوام پر چھوڑ دیں۔ خود کوئی متعین چیز دے نہیں سکتے اور دوسروں سے لینے پر تیار نہیں۔ اس پیچیدگی کا حل کیا ہے؟

(۴)

اداریے پر تبصرہ ہو چکا، لیکن آخر میں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ سلہری صاحب کے چھیڑے ہوئے مسائل کی گہرائی میں اتر کر اصل قابلِ حل مسئلہ کو سامنے لائیں۔ سلہری صاحب اپنے اداریے میں اس وسیع موضوعِ فکر کو صرف باہر ہی باہر سے مس کر سکے ہیں لیکن اس کے اندر اتر نہیں سکے، کیونکہ درحقیقت ان کی تمام تر توجہ ہمارے اہم ترین تاریخی و ملّی پرابلم سے پیدا ہونے والی سطحی بحثوں پر مرتکز رہ گئی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس بھاری پرابلم پر نگاہ ڈال کر اسے سمجھ سکے ہوں۔

ملتِ اسلامیہ پچھلے دو تین قرنوں سے غلامی کے خلاف جدوجہد کرتی ہوئی کرۂ ارضی کے ہر گوشے میں آزادی سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ آزادی کا آفتاب جب کسی سرزمین پر چمک اٹھتا ہے تو احساسات جاگ اٹھتے ہیں، ولولے کروٹیں لیتے ہیں، عزائم ابھرنے لگتے ہیں اور جو کچھ فکر و شعور پیچھے سے بنتا چلا آیا ہو وہ زندگی کی باگ ڈور تھامنے کے لیے میدان میں آجاتا ہے۔ پاکستان بھی آزادی کی صبح سے دوچار ہے۔ قدرتی طور پر اجتماعی زندگی حرکت اور اقدام اور نشوونما چاہتی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے کہ جب پیدا ہو جاتی ہے تو خیالات کی رَو کو اس جگہ روک کر نہیں رکھا جا سکتا جہاں وہ پہلے سے یخ بستہ ہو کر کھڑی تھی۔ صبح کی شعاعوں کی گرمی نے برف کو پگھلا کر سیّال بنا دیا ہے اور

ہر سیال چیز بہنا چاہتی ہے۔ آزادی نے ارادوں کو جگا دیا ہے اور ہر جاگتا ہوا ارادہ اقدام کرنا چاہتا ہے۔ جس حالت میں ہم آج کھڑے ہیں اس پر کسی ایک فرد کے اندر بھی اطمینان باقی نہیں رہا۔ قوم کا اجتماعی ذہن تبدیلی چاہتا ہے۔ تاریخ کو ہم جکڑ بند کر کے موجودہ مقام پر کھڑا نہیں رکھ سکتے۔

لیکن اسے کس رُخ پر آگے بڑھنے کا راستہ بنا کے دیا جائے؟

سب سے پہلے مغربی فکر و تمدن کی کشش ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہم میں سے بعض لوگ چاہتے ہیں اور شاید خیر خواہی ہی کے جذبے سے چاہتے ہیں کہ ہماری قوم کو قدم بہ قدم اقوام مغرب کے پیچھے سیدھے مادہ پرستانہ فکر و تمدن کی راہ پر بڑھ جانا چاہیے۔ یہی راہِ ترقی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ محض چند افراد — ذہین سے ذہین اور خیر اندیش سے خیر اندیش افراد — کا چاہنا اس معاملے میں فیصلہ کن نہیں ہو سکتا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی شعور و ارادہ تاریخی عوامل کے زیرِ اثر کیا میلانات اختیار کر چکا ہے۔ اس لحاظ سے حالات پر کوئی رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کی سطح پر پیرتے رہنے کے بجائے اس کی گہرائیوں کی غواصی کی جائے اور حکیمانہ غیر جانبداری سے کھوج لگایا جائے کہ اس سمندر کی تہہ میں کیا ہے جو اچھلنا چاہتا ہے۔

چند تاریخی حقیقتیں اس عظیم مسئلے کی تحقیق کے لیے اندر اتریئے تو چند اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

ایک یہ کہ ہماری قوم مجموعی حیثیت سے اپنے مسلم ہونے کا احساس رکھتی ہے اور گہرا احساس رکھتی ہے۔ یہ احساس سخت درجے کے ناسازگار حالات میں بھی مٹ نہیں سکا بلکہ اس کی دور تک اتری ہوئی جڑیں برابر غذا حاصل کرتی رہی ہیں۔

دوسرے یہ کہ جہاں بلحاظ ایمان و عقیدہ اسلام کا پیرو اور علمبردار ہونے کا یہ احساس مرا نہیں ہے، وہاں دوسری طرف یہ شعور بھی افراد اور معاشرہ کے اجتماعی ذہن میں موجود ہے کہ ہماری عملی زندگی اور ہمارا اجتماعی نظام اسلامی بہ حال نہیں ہے۔ فراری ذوق نے اس شعور سے بچنے کے لیے ہزار پناہ گاہیں گذشتہ صدیوں میں تعمیر کیں، لیکن اس شعور کے حملے کی زد سے بچنا ممکن نہیں ہو سکا۔ اس شعور کو زندہ رکھنے میں قرآن و حدیث کے مطالعہ نے اصل پارٹ ادا کیا ہے۔

اس کے ساتھ مسلمان چونکہ اسلامی نظام کے دورِ سعادت کی زریں تاریخ کا ایک ایک باب نہایت محفوظ شکل میں سینوں سے لگائے چلے آ رہے ہیں اور یہ تاریخ جو ان کے لٹریچر، ان کے ادب، ان کی صحافت، ان کی خطابت میں پوری طرح رچی بسی ہوئی ہے، زندگی کے ایک ایک پہلو کے بارے میں — ان کو بول بول کے کہتی ہے کہ یہاں فلاں فلاں انحراف

کارفرما ہے۔

تیسرے یہ کہ اس قوم کا یہ احساس و شعور محض زینتِ دماغ نہیں بنا رہا بلکہ اس نے بار بار ذوقِ تعمیر اس کے اندر پیدا کیا ہے اور اس ذوقِ تعمیر نے یکے بعد دیگرے تجدید و احیائے اسلام کی تحریکیں اس کے دائرے میں برپا کردی ہیں۔ ان تحریکوں کا یہ نتیجہ بہرحال نکلا ہے کہ ذوقِ تعمیر کی یہ لہر ہمیشہ موجود رہی ہے اور اپنا تاریخی اثر رکھتی ہے۔

چوتھے یہ کہ یہ مسلمان ہونے کا احساس اور عملاً اسلام سے ہٹے ہونے کا چھپتا ہوا شعور ایسی موثر طاقتیں ہیں کہ مسلمان ان کے بل پر ایک ایک ملک میں امپیریلزم اور سامراج کے خلاف لمبی لڑائیاں لڑتے ہیں اور لڑ رہے ہیں۔ جب بھی وہ متحد ہوئے ہیں، جب بھی متحرک ہوئے ہیں اور جب بھی انہوں نے قربانیاں دی ہیں اسلامی آئیڈیالوجی کی محبت میں دی ہیں۔ بار بار کے تجربوں نے ان پر ثابت کردیا ہے کہ یہی ان کی زندگی، ترقی اور سرگرمی کا اصل سرچشمہ ہے۔ پھر چونکہ آزادی کو انہوں نے فی نفسہٖ نصب العین بنا کر کبھی بھی کام نہیں کیا بلکہ کھوئی ہوئی اسلامی زندگی کو پالینے کی تمنا میں آزادی کو ایک ذریعہ و وسیلہ کی حیثیت سے چاہا ہے اس لیے ہر جگہ تعمیرِ نو کے لیے سب کی نگاہیں اسی آئیڈیالوجی پر مرتکز ہیں۔

پانچویں یہ کہ مغربی فکر و تمدن کے تسلط نے دوسری ایشیائی قوموں کا ذہن جس طرح اپنے سانچے میں کامیابی سے ڈھال لیا ہے اور ان میں مادہ پرستانہ قومی سیکولر نظاموں کے لیے ایک واضح میلان پیدا کردیا ہے، مسلمانوں پر اسے ویسی کامیابی نہیں ہوئی۔ اگرچہ مسلمان معاشروں پر اس کے گہرے اثرات پڑے ہیں اور چھوٹا موٹا ایک نہ ایک طبقہ ان میں مغربی اثرات کے سامنے بڑی حد تک مفتوح ضرور ہوا ہے، لیکن اسلامی آئیڈیالوجی کی ڈھال لے کر قوم کے اجتماعی ذہن و فکر نے اپنے آپ کو مغربی فکر و تمدن کے حملوں سے بچا لیا ہے۔ مسلمانوں میں مرعوبیت اور تقلید کا ایک حد تک پرتو ضرور پڑا ہے لیکن پوری طرح ہتھیار ڈالنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ مخالفِ اسلام اثرات کے خلاف برابر لڑ رہے ہیں اور یہ لڑائی جاری ہے۔

چھٹے یہ کہ مغربی فکر و تمدن کا تجربہ اب اس حد تک مکمل ہوچکا ہے کہ اس کے کمزور اور فاسد پہلوؤں کے نتائج اور بہت ہی تلخ اور تباہ کن نتائج ـــ ابھر ابھر کر سامنے آرہے ہیں۔ ان نتائج کی تلخی اور تباہ کاری کو خود اہلِ مغرب محسوس کررہے ہیں اور نت نئی پیچیدگیوں کے پیش آنے پر وہاں کے اربابِ علم و حکمت خود پریشان ہو رہے ہیں۔ اس صورتِ حالات نے مسلمانوں کو بروقت متنبہ کردیا ہے۔

یہ ہیں وہ تاریخی حقیقتیں جن کے ہمہ گیر اثرات نے ہمارے اجتماعی ذہن میں اسلامی فکر اور اسلامی نظریے کو پوری مضبوطی سے جما دیا ہے۔ یہ قوم کہیں بھی ہو، نہ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کر سکتی ہے، نہ وطنی قومیت کو دل میں جگہ دے سکتی ہے نہ سیکولرازم کو قبول کرنے پر تیار ہو سکتی ہے، نہ مغربی فکر و تمدن کی اندھی تقلید کر سکتی ہے، نہ کمیونزم کو جذب کر سکتی ہے اور نہ موجودہ حالت پر نخ بستہ ہو کے پڑی رہ سکتی ہے۔ یہ قطعی طور پر اسلامی نظامِ زندگی ہی کی جانب رُخ کر کے نیا سفرِ حیات شروع کر سکتی ہے۔ یہ صورتِ حال کسی ایک ملک کے لیے خاص نہیں، کرۂ ارضی کی تمام مسلمان آبادی اسی تاریخی کیفیت سے گزر رہی ہے۔ اسی تاریخی کیفیت نے ہر جگہ اسلامی تحریکیں برپا کر دی ہیں۔

تضاد اور کشمکش سوال یہ ہے کہ پھر یہ حرکت کیوں نہیں شروع ہوتی، اس میں رکاوٹ کیا ہے؟ رکاوٹ صرف یہ ہے کہ ہر جگہ قیادت کی باگ ڈور پہلے سے ایسے ایک طبقے کے ہاتھ میں ہے جو کچھ تو اپنے مناصب اور مفاد کی خاطر اور کچھ اپنے مغرب سے قبول کردہ جدید نظریات کے زیرِ اثر اجتماعی ذہن کے تاریخی رجحانات کا ساتھ نہیں دے رہا۔ یہ طبقہ عوامی میلانات کو اپنی خواہش کے تحت لے کے چلنا چاہتا ہے، اور چونکہ وہ اس سمت نہیں چلتے، لہٰذا ان کو کسی دوسری طرف بڑھنے سے روک رکھنا چاہتا ہے اسے بڑی غلط فہمی ہے کہ کبھی یہ اس کیفیت کو کسی فرد کی شرارت قرار دیتا ہے، کبھی سمجھتا ہے کہ یہ چند ملاؤں کا فتنہ ہے اور کبھی رائے قائم کرتا ہے کہ یہ فلاں دینی تنظیم کا اٹھایا ہوا طوفانِ فساد ہے۔ حالانکہ ایسے موثر تاریخی عوامل جب کام کرنے لگتے ہیں تو افراد اور تنظیموں کا پارٹ بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ان عوامل کے لیے ظاہری ذریعۂ اظہار اور وسیلۂ کار بنتے ہیں۔ اس غلط جائزہ کی وجہ سے وہ عجیب و غریب تضاد اور وہ دلچسپ کشمکش نمودار ہوئی ہے جس میں ایک طرف ہماری ہزار سالہ تاریخ فریق بن کام کر رہی ہے اور دوسری طرف ایک مختصر سا طبقہ اس کے سامنے مدافعانہ پوزیشن لیے ہوئے ہے۔

یہ ہے وہ تاریخی تضاد (HISTORICAL CONBLICT) جو اصل عظیم مسئلہ ہے اور فوری طور پر قابلِ حل مسئلہ ہے۔ یہ وہ توجہ طلب صورتِ واقعہ ہے جس پر ہمارے اونچے دماغوں کو فکر و کاوش کی ساری توانیں صرف کر دینی چاہئیں۔ مصر میں اخوان کو پھانسی چڑھا دینے اور پاکستان میں جماعت اسلامی کو خلافِ قانون قرار دینے سے یہ گرہ بہرحال نہیں سلجھ سکتی۔ کسی کے پاس کوئی ایسا آمرانہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اس تاریخی تضاد و کشمکش کو تختہ دار پر لٹکا سکے اور کسی کے ہاتھ میں کوئی ایسی پاور نہیں ہے کہ اس عظیم مسئلے کو خلافِ قانون قرار دے سکے۔ ہم سلہری صاحب سے بھی اور دوسرے تمام سوچنے سمجھنے والے

حضرات سے بھی درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ اس اصل گتھی کو سلجھائیے۔

دو حل یہ لاینحل نہیں ہے، بس صرف توجہ کی دیر ہے اگر ہمارے ذمہ دار لوگ کشمکش کے سطحی مظاہر سے نیچے اتر کر اصل وجہ کشمکش سے نجات پانے کی فکر کریں تو نہ کسی اخوان المسلمون سے پھر کوئی خطرہ رہ جاتا ہے، نہ کسی جماعت اسلامی کے وجود پر اضطراب!

اس کا ایک حل یہ ہے کہ کسی تدبیر سے مسلمان قوم کو مسلمان ہونے کے احساس اور اسلامی زندگی کے شعور اور اس تک پہنچنے کی تمنا سے خالی کر دیجیے۔ اس کے بعد جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ ہو جائے گا اور کوئی خرخشہ باقی نہیں رہے گا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ خصوصاً جب تک قرآن موجود ہے، جب تک حدیث اور سنت کا ریکارڈ محفوظ ہے، جب تک دورِ سعادت کی تاریخ قوم کے حافظے پر ثبت ہے، جب تک اسلام کی روایات اور قدریں ہمارے لٹریچر، ہماری صحافت اور ہماری خطابت میں رچی بسی ہیں یہ قطعاً ناممکن ہے! اسے اگر سطحی نظر کے ساتھ آپ ممکن تصور کریں اور جبر و قوت سے قومی مزاج بدلنے کی کوشش شروع کر دیں تو ایک تو مسلمان قوم کے اپنے ہی خون سے آپ کو ہاتھ رنگنے ہوں گے، اسلامی رجحانات کو نہایت سخت گیرانہ طریق سے مسلسل دبانا ہوگا، اور چونکہ یہ بالکل مر نہیں سکتے اس لیے ہمیشہ ان کے درپے رہنا ہوگا، اپنی قوم سے معاملات کو سالہا سال کے لیے بگاڑنا ہوگا اور اس طرح کی لمبی کشمکش میں عمریں گذارنے کے لیے جمہوری فضا کو ختم کرنا ہوگا۔

اب سوچیئے کہ اس مہلک اور تباہ کن حل کو اختیار کرنے کے دور رس نتائج کیا نکلیں گے؟ ملکی حالات مصر و ایران کے معیار پر جا گریں گے اور بین الاقوامی لحاظ سے قومی وقار ختم ہو جائے گا۔ قوم کے ولولے بجھ کے رہ جائیں گے اور اس کی طاقتوں کو کسی بڑی تعمیری مہم میں استعمال نہ کیا جا سکے گا۔ آگے چل کے جب مزید ردعمل پیدا ہوں گے تو کمیونزم جیسے فتنوں کو آئیڈیالوجی کے خلا کی وجہ سے حملہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اس وقت بچاؤ کرنے والی کوئی فکری طاقت موجود نہ ہوگی۔ علاوہ بریں بین الاقوامی توڑ پھوڑ کے ہنگامے میں اگر خدانخواستہ کوئی بڑا حادثہ قوم کو پیش آ گیا تو اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوئی مؤثر ذہنی و اخلاقی سامانِ دفاع بہم نہ پہنچ سکے گا۔ بیسیوں سال اسی حالتِ تعطل میں گذر جائیں گے اور قوم پستی سے نہ نکل سکے گی۔ لیکن بیسیوں سال کے بعد بھی جب آپ جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ "اسلامی رجحان" اب تک بھی مرا نہیں ہے بلکہ وہ خطرہ بدستور اپنی جگہ پر قائم ہے۔ جیسے کہ ترکیہ میں تیس پینتیس سال کا عرصہ اسلامی رجحان کے خلاف حکمران طاقت نے معرکہ آرائی میں صرف کر دیا اور آج بھی وہاں حال یہ ہے کہ یہ رجحان بدستور کام کر رہا ہے اور اسے کچلنے کے لیے برابر قوم کا سرمایۂ قوت برباد کیا

جاتا رہتا ہے۔ ذرا اگر جمہوریت کی فضا پیدا ہو جائے تو فوراً یہ ایک مضبوط تحریک کی شکل اختیار کر جائے گا۔ سوچیے کہ قومی قوتوں کو اس بے جا کشمکش میں جھونکتے رہنے کا حاصل کیا ہوا؟

دوسرا حل یہ ہے کہ حکمراں طبقہ ذرا سی لچک اپنے اندر پیدا کر لے اور نظریاتی ضد چھوڑ دے۔ وہ یہ حقیقت تسلیم کر لے کہ قوم میں اسلامی نظامِ زندگی کے لیے عوامی تقاضا کارفرما ہے۔ وہ اس تقاضے کو لوحِ تاریخ پر باریک نظر سے پڑھے اور اسے قبول کر لے۔ بس فکر و نظر کی ذرا سی یہ تبدیلی اور ضدم ضدا کے جذبات کی معمولی سی یہ قربانی صورتِ حالات کا پورا نقشہ بدل سکے رکھ سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا حل ہے کہ جو تاریخی تضاد و کشمکش کا خاتمہ کر کے ملت کی تمام طاقتوں کو ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ اس حل کو اختیار کرنے سے قوم کو آئیڈیالوجی کی قوتِ محرکہ مل جاتی ہے، اسے ایک بنائے اتحاد ہاتھ آتی ہے، اسے ترقی کرنے کے لیے ایک رہنما قوت بہم پہنچ جاتی ہے، اور وہ دنیا کی عظیم قوموں کی صف میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو سکتی ہے۔ اس حل کو قبول کر لینے سے ہمیں وہ ہتھیار مل جاتا ہے جس سے کمیونزم اور دوسرے باطل نظریات کے حملوں کو روکا جا سکے[1]۔ اس صورت میں ہم ایک ایسی طاقت سے مالا مال ہو جاتے ہیں جو ہمیں بین الاقوامی حادثات کے طوفان میں چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے۔

ہم سلہری صاحب اور اپنے اکابر اور اس طبقے کے تمام ذہین لوگوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس حل پر غور کریں۔ آخر کیوں یہ بات بالکل ناممکن قرار دے دی گئی ہے کہ ملت پر اثر انداز ہونے والے[2] تاریخی تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا جا سکتا اور کیوں یہ ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلامی تحریکوں کا خون بہا کر ہی آگے چلا جا سکتا ہے۔ جو ناکام اور احمقانہ حل ناصری آمریت[3] نے اختیار کیا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان کے اکابر بھی اسی کو قابلِ تقلید مثال بنائیں؟

---

[1] چنانچہ زیرِ تدوین دستور سے لوگوں کو یہی امیدیں تھیں کہ اس کے نفاذ سے ہم مذکورہ بالا تاریخی تضاد و کشمکش سے نجات پا کر ایک متحدہ طاقت کی حیثیت سے کام کر سکیں گے۔

[2] غور فرمائیے کہ بنو امیہ کے عہد سے لے کر آج تک ذرا سی راج ہٹ کے لیے امت کے بہترین عناصر کا جتنا خون بہایا گیا ہے اور اس دور میں بھی ترکیہ اور مصر میں ملتِ اسلامیہ کی جس فعّال طاقت کو دریا برد کیا گیا اور کیا جا رہا ہے، پھر خود پاکستان میں بھی عدم تعاون ہی نہیں تشدد کر کر کے دینی طاقتوں کو جتنا کمزور کیا جا رہا ہے، اگر اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کی یہ مہم اس طرح جاری نہ رکھی جاتی تو ہماری نوبتِ تعمیر کتنی بڑی ہوتی اور ہم اپنے موجودہ مقام سے کتنے آگے ہوتے۔

کوئی نہیں کہتا کہ جدید حالات اور تقاضوں سے آنکھیں بند کرکے چلیئے ، کسی میں یہ انتہا پسندی کارفرما نہیں ہے کہ پورے کا پورا اسلام آناً فاناً یہاں سے وہاں تک چھا جائے ، بلکہ سب لوگ تدریج کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں ۔ کوئی نہیں چاہتا کہ وہی تن تنہا سب کچھ (ALL IN ALL) ہو ، کسی کو موجودہ حکمرانوں سے کوئی چڑ اور کد نہیں ہے کہ ان کو ضرور ان کے مناصب سے ہٹانا ہے اور اسلام کا نام اسی کد کو پورا کرنے کے لیے نقابِ فریب کے طور پر استعمال کرنا ہے ۔ آپ لوگ دوسروں کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور قومی عناصر اور طاقتوں کو باہم دگر پھاڑیئے نہیں بلکہ زبان و قلم سے ان کو قریب تر کرنے کی فکر کیجئے ۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسلام کو کسی درجے میں اپنایئے اور خلوص سے اپنایئے اور پھر تھوڑا یا بہت عملی کام کرکے دکھایئے ۔ جس دن آپ نے تبدیلی کا ثبوت ہمارے اکابر نے دے دیا اُس دن بالکل نئے جذبات اور نئے حالات کے سرچشمے پھوٹ پڑیں گے ۔ جو شخص اس صف میں سب سے پہلے آگے بڑھ کر یہ تجربہ کرے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ اس کے کتنے اچھے نتائج سامنے آتے ہیں اور کتنی بڑی قبولیتِ عامہ اس کا خیر مقدم کرتی ہے ۔ سلہری صاحب سے درخواست ہے کہ وہ اوپر کی بحث سے اگر کوئی ناگوار اثر بھی لیں تو اسے اس موقع پر ذہن سے الگ کرکے ان نقاطِ فکر کے مطابق بھی ذرا غور فرمائیں ۔ پہلے حل اور دوسرے حل کے نتائج کے فرق کا جائزہ لیں ۔ پھر اپنے ہی سامنے یہ سوال رکھیں کہ کیا یہ دوسری صورت بالکل ناممکن ہے ؟

سلاجقہ

(سیّد ابوالاعلیٰ مودودی)

دولتِ عباسیہ کے سیاسی زوال کے بعد جس سلطنت نے ممالک اسلامیہ کے بیشتر حصّہ کو ایک مرکز پر جمع کیا اور مسلمانوں کو سیاسی انتشار اور پراگندگی سے نکال کر دنیا کے سامنے عالمِ انسانی کا رہنما اور امام بنا کر آخری مرتبہ پیش کیا وہ سلجوقی سلطنت تھی اس کے کارنامے مولانا کی اس تاریخی کتاب میں ملاحظہ کیجیے ۔ قیمت : ۳/۸

طاہر رسول قادری ، سول ایجنٹ ، ۸۱ پیر غازی روڈ ، اچھرہ ، لاہور

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی (پاکستان) اور اپنے شہر کے کتب فروشوں سے حاصل فرمائیں